

اکیسویں صدی کا ولی (1)

جب میں پروفیسر احمد رفیق سے پہلی بار ملا تو دل سے بزرگ ماننے پر تیار نہ ہوا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں، مثلاً اس کا کلین شیو ہونا، مسلسل سگریٹ پئے جانا، ان موضوعات پر بلا تکان گفتگو کرنا، جن کے ذکر پر ہی کمزور دل حضرات کے کان سرخ ہو جاتے ہیں اور اپنی بے عزتی پر قہقہہ لگا کر مخاطب کو داد دینا وغیرہ وغیرہ، لیکن جب میں مایوس ہو کر اٹھنے لگا تو اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ مجھ سے کہنے لگا: ”اپنا نام تو بتاتے جاؤ“۔ میں نے فوراً بتا دیا (یہی میری غلطی تھی) تو ہنس کر بولا: ”تمہارے اندر ”انگلیزائی“ بھری ہے، غصہ اور نفرت ابل رہی ہے، اگر یہ باہر نہ نکلی تو تم پھٹ جاؤ گے۔ بالکل اس طرح جیسے غبارہ دھماکے سے پھٹتا ہے۔“ میں نے کہا: ”تمہیں کیا غرض۔“ تو بولا: ”مجھے تم سے بڑی غرض ہے، ذرا بیٹھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ اور میری حماقت دیکھیے میں شغل ہی شغل میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے بعد پتہ نہیں اس نے مجھ پر کیا پھونکا کہ آج آٹھ برس ہو چکے ہیں، میں اسی کے پاس بیٹھا ہوں۔ کہیں بھی بھاگ جاؤں، کہیں بھی چھپ جاؤں، کہیں بھی غائب ہو جاؤں، خود کو اسی کے قریب پاتا ہوں، اسی صوفے، اسی کمرے اور اسی نیم تارک ماحول میں رہتا ہوں اور اب تو یقین ہو چکا ہے کہ شاید پچاس برس بعد بھی جب کوئی مجھ سے پوچھے گا تمہاری زندگی کا حیرت انگیز واقعہ کیا ہے؟

تو میں بلا سوچے سمجھے کہہ دوں گا۔ ”پروفیسر احمد رفیق۔“
اور اگر کوئی پوچھے گا۔

”تمہاری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟“
تو میں بلا کم و کاست کہہ دوں گا۔ ”پروفیسر احمد رفیق۔“
اور اگر کوئی پوچھے گا۔

”تمہاری زندگی کی سب سے بڑی محرومی کیا ہے؟“

تو بھی میں بلا خوف و تردید کہہ دوں گا ”وہ وقت جو میں نے پروفیسر احمد رفیق سے دُور رہ کر گزارا۔“
اور اگر پوچھنے والا پوچھے گا۔

”کیوں؟“

تو میں فوراً کہوں گا ”اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی جھوٹے خداؤں کی پرستش میں گزار دیتا۔ اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی اندھیرے میں بھٹکتے بھٹکتے گزار دیتا، اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو

میں شاید باقی زندگی بھی کسی صاحب کشف صاحب دعا اور صاحب نظر بزرگ سے ملاقات کی خواہش لیے ہی گزار دیتا۔ اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی با عمل عالم کی تلاش میں گزار دیتا لیکن ایسا نہیں ہوا کہ اگر موج موج ہے تو کناروں سے ضرور ٹکراتی ہے۔ اگر ہوا ہوا ہے تو قطرہ خون میں ضرور اترتی ہے اور اگر روشنی روشنی ہے تو وہ اندھیروں کا سینہ ضرور چیرتی ہے۔“

میں نے پروفیسر احمد رفیق سے پوچھا: ”پروفیسر صاحب آپ ایک نظر میں لوگوں کو کیسے جان لیتے ہیں؟“
پروفیسر نے قہقہہ لگایا اور بولا: ”جب اللہ سے دوستی کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دوستوں کو بہت سی کنجیاں دے دیتا ہے۔ ان کنجیوں میں ایک کنجی دلوں کے قفل کھولنے کی بھی ہوتی ہے۔“
”یہ کیا کنجی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

یہ علم اسماء ہے۔ قرآنی اسماء جو قدرت کی ہارڈ ڈسکس ہیں یہ ہارڈ ڈسکس چودہ (حروف مقطعات) ہیں ہر ڈسک میں مختلف لوگوں کے ذہنی اور روحانی حالات درج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان حروف کے علم سے نوازا ہے لہذا جو نہی کوئی نام میرے کانوں سے ٹکراتا ہے اس کی پوری شخصیت میرے دماغ میں اتر آتی ہے۔“
میں نے پروفیسر سے پوچھا: ”پروفیسر صاحب آپ کو خدا کیسے ملا؟“

اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا: ”صرف خلوص سے جب میں نے خدا کو پہچان لیا تو میں نے دیکھا کسی بزرگ نے اسے پانے کے لیے چالیس برس جنگلوں میں ننگے پاؤں گزار دیئے کوئی کنویں میں الٹا لٹک کر وظیفہ کرتا رہا، کوئی دریا میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر اسے یاد کرتا رہا..... تو میں نے اپنے رب سے دعا کی یا اللہ! اگر صرف جسمانی طور پر مضبوط لوگ ہی تمہیں یاد کر سکتے ہیں تو شاید میں پوری عمر تمہیں نہ پاسکوں لیکن اگر کمزوروں کا بھی تم پر اتنا ہی حق ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میں زندگی میں کبھی تم سے رخ نہیں بدلوں گا تم سے اپنی ”کمٹمنٹ“ نباہوں گا تو مجھے خدا مل گیا۔“

میں نے پروفیسر سے پوچھا: ”پروفیسر صاحب آج کل خدا کی کیا پوزیشن ہے؟“
پروفیسر نے قہقہہ لگایا اور بولا: ”آج کل خدا کی پوزیشن کو بڑا خطرہ ہے اُدھر دنیا میں اطلاعات اور علوم کا ایٹم بم پھٹ چکا ہے ذہنوں میں نئے سوال پیدا ہو چکے ہیں لیکن ادھر ہمارے مولوی ابھی تک اونٹ پر سواری کے دور سے گزر رہے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سوال دنیا کے بہترین اداروں کے پڑھے لکھے اعلیٰ ترین دماغ کرتے ہیں لیکن جواب وہ ان پڑھ اور گنوار مولوی دیتا ہے جسے ابھی تک چاند کی تسخیر کا دعویٰ ہضم نہیں ہوا۔ لہذا انہیں ہماری سمجھ آتی ہے اور نہ ہم ان کی سمجھ سکتے ہیں۔ اس ”کمیونٹی کیشن گیپ“ میں اللہ تعالیٰ کا تصور تیزی سے ”ڈی شیپ“ ہو رہا ہے نعوذ باللہ۔ اہل یورپ کی نظر میں اس کی ایک متعصب تنگ نظر اور وحشی قوم کے ”لیڈرز“ جیسی شکل بن رہی ہے۔ چنانچہ جب تک پڑھے لکھے اور جدید علوم و فنون سے آراستہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ”ایڈوائزرز“ بن کر سامنے نہیں آئیں گے خدا کا تصور وسیع نہیں ہوگا۔“

پروفیسر کی کہانی بڑی عجیب ہے۔ ایم اے انگریزی کیا لاہور کے ایک کالج میں پروفیسری شاعری کی

ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کیا، لیکن اس دوران جب اللہ تعالیٰ سے ڈائریکٹ ڈاننگ شروع ہوئی تو گوجر خان آبیٹھا، جہاں اب دن رات ذہنوں کی پیاس بجھاتا ہے، گمراہوں کو راہ دکھاتا ہے، پریشان حال لوگوں کے دکھ سنتا ہے اور آخر میں ہر آنے والے کو کاغذ کی ایک چٹ پر چند اسماء الہی لکھ دیتا ہے، اب پتا نہیں ان اسماء الہی میں کیا ”جادو“ ہے جو انہیں پڑھتا ہے وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا ہو جاتا ہے اور جب خدا اور بندہ باہم مل کر ایک ہو جائیں تو کیا دنیا کا کوئی مسئلہ مسئلہ رہ جاتا ہے؟

اگر پروفیسر کی ذات سے ”روحانی بلوغت“ نکال بھی دی جائے تو بھی اللہ تعالیٰ نے اسے دلوں پر اثر کرنے والی شخصیت، جاذب طرز تکلم اور بے پایاں علم سے نوازا ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کے لیے کسی دوسرے معجزے کی ضرورت نہیں رہتی۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا: ”پروفیسر صاحب آپ نے اتنا علم کہاں سے حاصل کیا؟“
وہ گہرے اطمینان سے بولا: ”خدا سے کہ سارے علوم کے دھارے اسی کی ذات سے نکلتے ہیں۔ جو اس کا ہو گیا وہ گویا علم کے سمندر میں ڈوب گیا۔“

اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا آج کا کوئی انسان پروفیسر کے بغیر خدا کے جدید تصور کو چھو سکتا ہے تو جواب ملا نہیں کہ اکیسویں صدی کے لوگوں کو صرف پروفیسر احمد رفیق سے ہی روشنی مل سکتی ہے کیونکہ صرف یہی شخص ہے جو نہ صرف اکیسویں صدی کے دماغ کو سمجھتا ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ خدا کی بات کو کس لہجے اور کس فریکوئنسی میں کہا جائے تو وہ دلوں کے قفل توڑ کر ذات میں رچ جاتی ہے، بس جاتی ہے۔